درس ۲۴

فتح ونصرت کا نقطۂ آغاز

صلح حدیبیہ

﴿اِنَّا فَتَحْنَا لَکَ فَتْحًا مُّبِیْنًا﴾

سورۃ الفتح کے آخری رکوع کی روشنی میں

نحمدہٗ ونصلّی علٰی رَسولہِ الکریم ...... امَّا بَعد:

فَاَعُوذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیطٰنِ الرَّجِیْم ۔ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

﴿لَقَدْ صَدَقَ اللّٰہُ رَسُوْلَہُ الرُّءْیَا بِالْحَقِّ ۚ لَتَدْخُلُنَّ الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ اِنْ شَآءَ اللّٰہُ اٰمِنِیْنَ مُحَلِّقِیْنَ رُءُوْسَکُمْ وَمُقَصِّرِیْنَ ۙ لَا تَخَافُوْنَ ؕ فَعَلِمَ مَا لَمْ تَعْلَمُوْا فَجَعَلَ مِنْ دُوْنِ ذٰلِکَ فَتْحًا قَرِیْبًا ۝ هُوَ الَّذِیْ اَرْسَلَ رَسُوْلَہٗ بِالْهُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَہٗ عَلَی الدِّیْنِ کُلِّہٖ ؕ وَکَفٰی بِاللّٰہِ شَهِیْدًا ۝ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ ؕ وَالَّذِیْنَ مَعَہٗۤ اَشِدَّآءُ عَلَی الْکُفَّارِ رُحَمَآءُ بَیْنَهُمْ تَرٰهُمْ رُکَّعًا سُجَّدًا یَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰہِ وَرِضْوَانًا ۫ سِیْمَاهُمْ فِیْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ ؕ ذٰلِکَ مَثَلُهُمْ فِی التَّوْرٰىةِ ۚ وَمَثَلُهُمْ فِی الْاِنْجِیْلِ ۚ کَزَرْعٍ اَخْرَجَ شَطْـَٔہٗ فَاٰزَرَہٗ فَاسْتَغْلَظَ فَاسْتَوٰی عَلٰی سُوْقِہٖ یُعْجِبُ الزُّرَّاعَ لِیَغِیْظَ بِهِمُ الْکُفَّارَ ؕ وَعَدَ اللّٰہُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنْهُمْ مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِیْمًا ۝﴾ ...... صدق اللّٰہ العظیم

یہ سورۃ الفتح کے آخری رکوع کی آیات ہیں۔ سورۃ الفتح کے بارے میں یہ بات عرض کی جا چکی ہے کہ وہ تقریباً کُل کی کُل صلح حدیبیہ کے گرد گھومتی ہے۔ سیرتِ مطہرہ میں

یہ ایک اتنا اہم واقعہ تھا کہ اس پر ایک پوری سورۂ مبارکہ نازل ہوئی جس کا آغاز ان الفاظِ مبارکہ سے ہوا: ﴿اِنَّا فَتَحۡنَا لَكَ فَتۡحًا مُّبِيۡنًا﴾ ’’(اے نبی ﷺ!) ہم نے آپ کو ایک کھلی فتح عطا فرمائی۔‘‘

عام طور پر سطح بین لوگوں کے لئے فتح مکّہ کا واقعہ زیادہ اہم ہے‘ لیکن قرآن مجید پر اگر غور کیا جائے‘ حالات کے اصل رُخ کو سمجھا جائے اور حالات کی رفتار کی نبض پر اگر ہاتھ ہو تو واقعتاً یہ بات سامنے آتی ہے کہ فتح عظیم اور فتح مبین دراصل صلح حدیبیہ ہی تھی کہ جس کے بعد حالات اس تیزی سے مسلمانوں کے حق میں تبدیل ہوئے کہ یہ صلح درحقیقت فتح مکّہ کی تمہید ثابت ہوئی‘ جس کے نتیجے میں سرزمین عرب پر اسلام کا بول بالا ہو گیا۔

غزوۂ احزاب ۵ ھ میں واقع ہوا۔ یہ درحقیقت مشرکین عرب کی جانب سے نبی اکرم ﷺ کا راستہ روکنے کی ایک متحدہ کوشش تھی۔ اس کے لئے اتنی بھرپور تیاری ہوئی تھی‘ اتنا اہتمام ہوا تھا‘ اتنے مختلف گروہ اور اتنی مختلف قومیں اس میں جمع ہوئی تھیں کہ اس کا دوبارہ پھر اسی اہتمام کے ساتھ اعادہ تقریباً ناممکن تھا۔ نبی اکرم ﷺ کا دست مبارک حالات کی نبض پر تھا۔ آپؐ نے صورتِ حال کا صحیح صحیح اندازہ کر لیا تھا۔ چنانچہ جب اللہ تعالیٰ نے تائید غیبی اور معجزانہ امداد کے ذریعے اس غزوہ میں فتح عطا فرما دی اور دشمنوں کے لشکروں کو بے نیل ومرام واپس لوٹنا پڑا تو حضور ﷺ نے یہ خبر دے دی کہ: ((لَنْ يَّغْزُوْكُمْ قُرَيْشٌ بَعْدَ عَامِكُمْ هٰذَا)) اے مسلمانو! اب قریش دوبارہ تم پر حملہ آور نہیں ہوں گے۔ گویا آپؐ نے مسلمانوں کو صاف الفاظ میں فرما دیا کہ کفار کی قوّت اب ٹوٹ چکی ہے‘ ان کی ہمت جواب دے چکی ہے‘ یہ آخری بار تھی کہ انہوں نے اپنی ہمت کو مجتمع کر کے اتنا بھرپور حملہ کیا تھا۔ ساتھ ہی آپؐ نے یہ نوید بھی سنائی : ((وَلٰكِنَّكُمْ تَغْزُوْنَهُمْ)) کہ اب صورتِ حال تبدیل ہو چکی ہے (Tables have been turned) اب تم اقدام کرو گے‘ آئندہ آغاز تمہاری جانب سے ہو گا۔ اس سے صاف اندازہ ہو جاتا ہے کہ حالات کی رفتار پر نبی اکرم ﷺ کی پوری نگاہ تھی‘ پوری صورتِ حال

آپؐ کے سامنے عیاں تھی۔ چنانچہ اگلے ہی سال نبی اکرم ﷺ نے عمرے کے ارادے سے مکّہ کا سفر اختیار فرمایا۔

مسلمانوں کا سفرِ عمرہ۔ مشرکین مکّہ کی طرف سے مزاحمت

چشم تصور سے دیکھئے' مسلمان احرام باندھے ہوئے ہیں' ہتھیار اگرچہ ساتھ لئے ہیں لیکن نمایاں نہیں ہیں' تلواریں نیاموں کے اندر ہیں' ہدی کے جانور ساتھ ہیں۔ نبی اکرم ﷺ کے ساتھ چودہ سو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم محو سفر ہیں' مکّہ کی طرف منزل بہ منزل سفر طے ہو رہا ہے۔ ادھر مکّہ میں خبر پہنچی تو کہرام مچ گیا۔ مسلمانوں کو عمرے کے لئے آنے کی جرأت کیسے ہوئی؟ یہ چودہ سو مسلمان کس ارادے سے آ رہے ہیں؟ یہ سب کیا ہو رہا ہے؟ اہل مکّہ کے لئے ایک عجیب اور پیچیدہ صورتِ حال پیدا ہوگئی۔ مسلمانوں کو مکّہ میں داخلے کی اگر اجازت دیتے ہیں تو یہ گویا شکست تسلیم کرنے کے مترادف ہے۔ انہیں اگر روکنے کی کوشش کرتے ہیں تو اپنی حالت بھی نگاہوں کے سامنے ہے کہ اب اتنے طاقتور نہیں رہے کہ محمد ﷺ اور ان کے ساتھیوں کو روک سکیں۔ لیکن بہرحال جو بھی قوّت تھی اسی پر انحصار کرتے ہوئے اپنی ہمت کو مجتمع کر کے انہوں نے یہ طے کیا کہ جس طرح بھی ہو اِس وقت تو ہم محمد (ﷺ) کو مکّہ میں داخل نہیں ہونے دیں گے۔

حضور ﷺ حدیبیہ کے مقام پر پہنچ کر پڑاؤ ڈال دیتے ہیں۔ سلسلۂ جنبانی کا آغاز ہوتا ہے۔ سفارتیں آنی شروع ہوئیں' ادھر مکّہ سے کچھ لوگ آئے' انہوں نے کوشش کی کہ مسلمانوں کو مرعوب کریں' لیکن واقعہ یہ ہے کہ خود مرعوب ہو کر واپس لوٹے۔ سہیل بن عمرو' قریش مکّہ کا ایک بہت بڑا خطیب جا کر لوگوں کو خبر دیتا ہے کہ لوگو! میں نے بڑے بڑے شہنشاہوں کے دربار دیکھے ہیں' لیکن جس طرح محمد (ﷺ) پر ایمان لانے والے اُن پر پروانہ وار نچھاور ہونے کو تیار ہیں وہ عزت و احترام اور وہ محبت میں نے کبھی کسی انسان کی انسانوں کے دلوں میں نہیں دیکھی۔ لیکن بہرحال کفارِ مکّہ اس طرح فوری طور پر اپنی آن سے دستبردار ہونے کو تیار نہیں تھے۔ مسلمانوں کے کیمپ سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو سفیر کی حیثیت سے بھیجا جاتا ہے۔ ان کی واپسی میں تاخیر ہو جاتی ہے۔ خبر

اڑتی ہے کہ شاید وہ شہید کر دیئے گئے ہیں۔اس پر حضورﷺ بیعت لیتے ہیں' جسے سیرت کی کتابوں میں بیعتِ رضوان کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ چودہ سو صحابہ نبی اکرمﷺ کے ہاتھ پر بیعت کرتے ہیں اور خونِ عثمانؓ کا قصاص لینے کا عزم کرتے ہیں۔اس واقعے کا ذکر اسی سورۂ مبارکہ میں موجود ہے:

﴿لَقَدْ رَضِیَ اللّٰہُ عَنِ الْمُؤْمِنِیْنَ اِذْ یُبَایِعُوْنَکَ تَحْتَ الشَّجَرَۃِ﴾ (آیت ۱۸)

''اللہ تعالیٰ راضی ہو گیا ان اہلِ ایمان سے جنہوں نے (اے نبیﷺ!) آپ کے ہاتھ پر بیعت کی درخت کے نیچے۔''

اور:

﴿اِنَّ الَّذِیْنَ یُبَایِعُوْنَکَ اِنَّمَا یُبَایِعُوْنَ اللّٰہَ ط﴾ (آیت ۱۰)

''(اے نبیﷺ!) جن لوگوں نے آپ سے بیعت کی ہے انہوں نے درحقیقت اللہ سے بیعت کی ہے' ان کے ہاتھوں کے اوپر اللہ کا ہاتھ ہے''۔

بعد میں معلوم ہوا کہ یہ خبر بے بنیاد تھی۔

صلح کی یک طرفہ شرائط۔مسلمانوں کی ہیجانی کیفیت

بہرحال اس دوطرفہ گفت وشنید کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ایک مصالحت ہو جاتی ہے۔وہ مصالحت کہ جو بظاہر نبی اکرمﷺ کی طرف سے کسی قدر دب کر ہو رہی ہے' بظاہر کفر کو اس میں ایک غالب حیثیت حاصل ہے۔ طے ہو رہا ہے کہ آپ اس سال عمرہ نہیں کریں گے' اسی طرح واپس چلے جائیں گے' ہاں اگلے سال عمرہ ادا کرنے کے لئے آ سکتے ہیں۔ آئندہ دس سال کے لئے جنگ بندی کا معاہدہ (No War Pact) ہو رہا ہے۔اس میں کفار کی طرف سے یہ شرط بھی رکھی جاتی ہے کہ اگر کوئی مسلمان مکّے سے بھاگ کر مدینے پہنچا تو آپ کو واپس کرنا ہوگا اور اگر مدینے سے کوئی مسلمان مرتد ہو کر مکّے میں آ جاتا ہے تو ہم اس کو واپس کرنے کے پابند نہیں ہوں گے۔آنحضورﷺ اس شرط کو بھی تسلیم فرما لیتے ہیں۔ یہ ساری شرطیں مُنہ سے بول رہی ہیں کہ نبی اکرمﷺ کی طرف سے کچھ دب کر صلح کی جا رہی ہے۔صحابہ کرامؓ میں اضطراب و بے چینی ہے۔وہ بے چینی

خاص طور پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی شخصیت میں نمایاں ہو جاتی ہے۔ پریشان ہیں کہ یہ کیا ہو رہا ہے' کیوں ہو رہا ہے۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ سے کہتے ہیں کہ کیا ہم حق پر نہیں ہیں؟ اگر حق پر ہیں تو پھر ہم دب کر صلح کیوں کر رہے ہیں؟ یہی سوال وہ کسی قدر نامناسب لہجے میں خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی کرتے ہیں جس میں شدتِ جذبات کا رنگ غالب تھا' جس پر کہ پھر ساری عمر وہ کفِ تأسف ملتے رہے اور افسوس کرتے رہے۔ لیکن ظاہر بات ہے کہ یہ انداز درحقیقت حمیّت وغیرتِ ایمانی کا مظہر تھا۔

وہی حمیّت وغیرتِ ایمانی ایک اور انداز میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف سے بھی اُس موقع پر ظاہر ہوئی جب معاہدہ لکھا جا رہا تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم املاء (dictate) کروا رہے ہیں اور حضرت علیؓ لکھ رہے ہیں: ''بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ'' قریش کا نمائندہ اعتراض کرتا ہے کہ نہیں' جو پرانا انداز تھا اسی کو اختیار کیا جائے۔ ''بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ'' کی بجائے ''بِاسْمِكَ اللّٰهُمَّ'' کے الفاظ لکھے جائیں جو ہماری پرانی روایت کے مطابق ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ٹھیک ہے۔ آگے لکھا جاتا ہے: ''یہ ہے وہ معاہدہ جو محمد رسول اللہ اور قریش کے مابین ہوا''۔ اس پر نکتۂ اعتراض بلند کیا جاتا ہے کہ ہم آپ کو اللہ کا رسول نہیں مانتے' اگر رسول مان لیں تو سارا جھگڑا ختم ہو جائے' لہٰذا یوں لکھا جائے کہ: ''یہ محمد بن عبداللہ اور قریش کے مابین معاہدہ ہے''۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم مسکراتے ہوئے حضرت علیؓ سے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ کے الفاظ مٹا دو۔ حضرت علیؓ عرض کرتے ہیں کہ حضور! میرے اندر اس کی تاب نہیں ہے۔ گویا کہ یہاں بظاہر حکم عدولی ہو رہی ہے لیکن یہ بھی درحقیقت غیرت وحمیت ایمانی کا اظہار تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ مجھے دکھاؤ وہ الفاظ کہاں ہیں! اور پھر اپنے دست مبارک سے ''رسول اللہ'' کے الفاظ مٹا دیتے ہیں۔

اس پورے پس منظر میں جو بات دراصل سمجھنے کی ہے وہ یہ ہے کہ بظاہر دب کر جو صلح کی جا رہی تھی وہ کچھ ہی عرصے کے بعد ایک کتنی بڑی فتح مسلمانوں کے حق میں ثابت ہوئی۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ حالات کا رُخ کس درجے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر روشن تھا۔ اس صلح کو بلاشبہ آپؐ کے تدبر کا شاہکار قرار دیا جا سکتا ہے۔

تمام مسلمانوں کی ذہنی وجذباتی کیفیت اُس وقت کم وبیش وہی تھی جس کی کسی قدر عکاسی حضرت عمر اور حضرت علی (رضی اللہ عنہما) کے طرزِ عمل سے ظاہر ہوتی ہے۔ یہ دیکھ کر کہ کفارِ مکّہ کی ہر شرط حضور ﷺ قبول کئے جا رہے ہیں، ان پر شدید اضطرابی کیفیت طاری تھی۔

اس سلسلے کا یہ واقعہ بھی بڑا عجیب ہے کہ جب صلح کی بات مکمل ہوگئی تو حضور ﷺ نے مسلمانوں سے کہا کہ اب احرام کھول دو اور قربانی یہیں دے دو، لیکن کوئی شخص اپنی جگہ سے نہیں ہلا۔ آپؐ نے دوبارہ یہی بات ارشاد فرمائی، لیکن اب بھی کوئی نہیں اٹھ رہا۔ یہاں تک کہ تیسری مرتبہ فرمانے پر بھی کسی کو جنبش نہیں ہوئی۔ اس پر حضور ﷺ کچھ ملول ہو کر اپنے خیمے میں تشریف لے جاتے ہیں اور اپنی زوجہ محترمہ اُمّ المؤمنین حضرت اُمّ سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے کسی قدر شکوے کے انداز میں کہتے ہیں کہ میں نے تین مرتبہ مسلمانوں سے احرام کھولنے کو کہا لیکن کوئی ایک شخص بھی نہیں اٹھا۔ حضرت اُمّ سلمہؓ مسلمانوں کی جذباتی حالت کے پیش نظر مشورہ دیتی ہیں کہ حضور! آپ کسی سے کچھ نہ کہیے، بس اتنا کیجیے کہ خود اپنا احرام کھول دیجیے اور قربانی دے دیجیے، آپ سے آپ معاملہ ٹھیک ہو جائے گا۔ اور بعینہٖ یہی ہوا۔ جیسے ہی حضور ﷺ نے اپنا احرام کھولا اور قربانی دی، یوں محسوس ہوا گویا کہ بند کھل گئے اور سب صحابہؓ نے آپؐ کی پیروی کی۔

صلح کے اثرات۔ مسلمانوں کے حق میں

یہ صلح اس اعتبار سے بڑی اہم ہے کہ اس کے بعد نبی اکرم ﷺ کو دو سال کا عرصہ ایسا ملا جس میں آپؐ نے کئی محاذوں پر اپنے کام کو وسعت دی۔ جنگ وجدال کا خاتمہ ہو گیا۔ قریش کے ہاتھ گویا کہ بندھ گئے اور محمد ﷺ کے ہاتھ کھل گئے۔ دعوت وتبلیغ کا عمل پوری شدت کے ساتھ جاری ہو گیا۔ وہ اصحابِ صفہ جن کی تربیت مسجد نبویؐ میں ہو رہی تھی اب ان کے وفود تشکیل دیئے جا رہے ہیں، جزیرہ نمائے عرب کے طول وعرض میں تبلیغی سرگرمی اپنے پورے نقطۂ عروج کو پہنچ گئی ہے۔ یہی وہ دَور ہے کہ جس میں نبی اکرم ﷺ نے یہود کی قوّت پر آخری اور بھرپور وار کیا۔ اُس وقت تک یہود کے تینوں

قبیلے مدینہ منورہ سے نکل چکے تھے۔ بنوقینقاع کو غزوۂ بدر کے فوراً بعد ۲ھ میں اور بنونضیر کو ۴ھ میں دیس نکالا دیا گیا تھا' جبکہ بنوقریظہ کو ان کی عہد شکنی کی پاداش میں سخت ترین سزا دی گئی تھی۔ ان کے جنگ کے قابل تمام مَرد قتل کئے گئے تھے اور ان کا مال و اسباب مسلمانوں نے اپنی ملکیت میں لے لیا تھا۔ بہرحال یہود کی ساری بچی کھچی قوّت اب خیبر میں مجتمع ہو چکی تھی اور یہ اب یہود کے جلاوطن قبائل کا سب سے بڑا مرکز تھا۔ نبی اکرمﷺ نے ۷ھ میں اس پر حملہ کیا اور اللہ نے مسلمانوں کو فتح عطا فرمائی۔

دعوت کے بین الاقوامی مرحلے کا آغاز

اسی دو سال کے عرصے میں نبی اکرمﷺ نے پہلی بار اپنی دعوت کو آس پاس کے علاقوں میں وسعت دینے کے لئے قدم اٹھایا۔ یہ معاملہ سیرت میں ایک اہم موڑ کی حیثیت رکھتا ہے۔ جیسا کہ اس سے قبل سورۃ الجمعۃ کے درس کے ضمن میں عرض کیا جا چکا ہے کہ حضورﷺ کی بعثت صرف عرب کے لئے نہ تھی بلکہ آپؐ پوری نوعِ انسانی کی جانب رسول بنا کر بھیجے گئے تھے۔ لیکن دیکھئے کہ دعوت میں جو تدریج نبی اکرمﷺ نے ملحوظ رکھی وہ کس قدر منطقی اور معقول ہے۔ تیرہ برس تک نبی اکرمﷺ نے اپنی دعوت و تبلیغ کو صرف مکّے تک محدود رکھا۔ صرف ایک سفر کا ذکر ملتا ہے' یعنی طائف کا سفر۔ اور انہی دنوں میں ایک اور سفر بھی آپؐ نے کیا اور وہاں سے بھی آپؐ کو بظاہر ناکام ہی لوٹنا پڑا۔ تیرہ برس کے عرصے میں اہل مکّہ نے جب اپنے طرزِ عمل سے ثابت کر دیا کہ اس دعوت کے لئے اب یہاں مزید کوئی امکانات نہیں ہیں تب آپؐ مدینہ تشریف لائے۔ ہجرتِ مدینہ کے بعد بھی مسلسل سات برس تک آپؐ نے اپنی تمام مساعی کو اندرونِ ملک عرب مرکوز رکھا۔ حالانکہ آپؐ عرب اور عجم دونوں کی طرف مبعوث ہوئے تھے' آپؐ کی بعثت پوری نوعِ انسانی کے لئے تھی۔ چنانچہ نظری طور پر اس کا امکان تھا کہ جب آپؐ نے مکّے میں اپنی دعوت کا آغاز کیا اسی وقت آپؐ قیصر روم کو' کسریٰ فارس کو' مقوقس شاہِ مصر کو اور نجاشی شاہِ حبشہ کو بھی خطوط لکھ دیتے اور ان کی طرف ایلچی روانہ کر دیتے۔ لیکن نہیں' یہ بات ایک تدریج ہی کے ساتھ ہو سکتی تھی اور اس تدریج ہی میں معنویت پنہاں

تھی۔ چنانچہ ۷ ھ میں جب کہ اندرونِ ملک عرب نبی اکرم ﷺ کی قوّت کو تسلیم کیا جا چکا تب آپ نے بیرونِ ملک عرب اپنے خطوط اور ایلچی بھیج کر اپنی دعوت کے بین الاقوامی مرحلے کا آغاز فرمایا۔ صلح حدیبیہ درحقیقت اس بات کی علامت (symbol) تھی کہ قریش نے نبی اکرم ﷺ اور مسلمانوں کی اس حیثیت کو تسلیم کر لیا کہ اب آپؐ بھی ملک عرب کی ایک اہم طاقت ہیں۔ جب اس حد تک جزیرہ نمائے عرب کے اندر ایک فیصلہ کن حیثیت حاصل ہوگئی تب آپؐ نے اپنی دعوت وتبلیغ کا دائرہ وسیع کیا۔ یہی زمانہ ہے جب کہ آپؐ نے دعوتی خطوط بھیجے۔ یہی وہ وقت ہے جب آپؐ کے ایلچی آپ کے نامہ ہائے مبارک لے کر ہرقل روم کے دربار میں بھی گئے اور شاہِ ایران اور مقوقس مصر کے دربار میں بھی پہنچے۔ اسی طرح اطراف و جوانب کے جتنے بھی حکمران تھے اُن کی طرف آپؐ نے دعوتی خطوط بھیجے۔ یوں سمجھئے کہ صلح حدیبیہ کے بعد نبی اکرم ﷺ کی جدوجہد کے دو رُخ ہوگئے۔ ایک جانب ابھی اندرونِ ملک یعنی جزیرہ نمائے عرب کے اندر اس انقلاب کی تکمیل کے لئے جدوجہد جاری ہے تو دوسری جانب بیرونِ عرب بین الاقوامی سطح پر پیغامِ محمدی، دعوت وتبلیغ اسلام کا آغاز ہو رہا ہے۔

اس سے قبل کہ ہم نبی اکرم ﷺ کی حیاتِ طیبہ کے ان آخری سالوں کے دوران آپؐ کی جدوجہد کے ان دونوں رُخوں کو سمجھنے کی کوشش کریں، آیئے کہ پہلے ایک نگاہ ان آیاتِ مبارکہ کے ترجمے پر ڈال لیں جن سے اس گفتگو کا آغاز ہوا تھا، یعنی سورۃ الفتح کے آخری رکوع کی آیات۔

آیاتِ مبارکہ کے ترجمے پر ایک نظر

﴿لَقَدْ صَدَقَ اللّٰهُ رَسُوْلَـهُ الرُّءْيَا بِالْحَقِّ﴾ ''بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کا خواب سچا کر دکھایا۔'' حضورؐ نے عمرے کی غرض سے جس سفر کا ارادہ فرمایا تھا اس سے پہلے آپؐ نے ایک خواب دیکھا تھا کہ آپؐ عمرہ ادا فرما رہے ہیں۔ نبی کا خواب ایک نوع کی وحی ہوتا ہے، چنانچہ آپؐ نے اسی کی بنیاد پر سفر اختیار فرمایا۔ جب صلح حدیبیہ کے بعد یہ طے ہوگیا کہ عمرہ اس سال نہ ہو سکے گا تو بعض حضرات نے یہ خیال کیا کہ اس کے معنی تو

یہ ہوئے کہ وہ خواب جھوٹا ہو گیا! **نَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ ذٰلِكَ!!** حضورﷺ نے یہ وضاحت فرما کر اُن کے اس مغالطے کو دُور کیا کہ میں نے یہ نہیں کہا تھا کہ یہ خواب اسی سال ضرور پورا ہو گا‘ ہم عمرہ ان شاء اللہ ضرور کریں گے‘ یہ خواب غلط نہیں ہے۔ کم از کم اس سفر کا یہ فائدہ تو ہوا کہ مشرکین مکّہ نے مسلمانوں کی حیثیت کو تسلیم کر لیا اور آئندہ سال کے لئے طے ہو گیا کہ مسلمان عمرہ ادا کریں گے اور مشرکین ان کی راہ میں حائل نہیں ہوں گے۔ چنانچہ اگلے سال کے ذوالقعدہ ۷ھ میں وہ عمرہ ہوا جسے عمرۂ قضاء کہتے ہیں۔ تو یہاں دراصل اسی بات کی طرف اشارہ کیا جا رہا ہے کہ اللہ نے اپنے رسول کا خواب سچا کر دکھایا۔

﴿لَتَدْخُلُنَّ الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ اٰمِنِیْنَ مُحَلِّقِیْنَ رُءُوْسَكُمْ وَمُقَصِّرِیْنَ لَا تَخَافُوْنَ ؕ فَعَلِمَ مَا لَمْ تَعْلَمُوْا فَجَعَلَ مِنْ دُوْنِ ذٰلِكَ فَتْحًا قَرِیْبًا﴾

’’تم یقیناً داخل ہو گے مسجدِ حرام میں‘ ان شاء اللہ پورے امن کی حالت میں‘ اپنے سروں کو مونڈتے ہوئے بھی اور بال ترشوائے ہوئے بھی‘ اس حالت میں کہ تمہیں کسی کا خوف نہ ہو گا۔ تو اللہ جانتا ہے جو کچھ کہ تم نہیں جانتے‘ پس اللہ تعالیٰ نے اس سے پہلے ایک قریبی فتح کا سامان کر دیا۔‘‘

یعنی یہ کہ یہ صلح اب تمہارے لئے کامیابیوں کے نئے نئے دروازے کھولنے کا باعث بنے گی۔ تم بہت جلد اپنی آنکھوں سے دیکھ لو گے کہ صلح کے جس معاہدے کو قریش مکّہ اپنی فتح سمجھ رہے تھے وہ ان کی شکست تھی۔ چنانچہ وہ عمومی تاثر کہ محمد رسول اللہﷺ نے دب کر صلح کی ہے‘ غلط ثابت ہوا اور یہ صلح مسلمانوں کے حق میں ایک فتح عظیم ثابت ہوئی۔

اس کے بعد یہاں سورۃ الفتح کے آخری رکوع میں بھی وہی آیۂ مبارکہ وارد ہوئی ہے جو آنحضورﷺ کے مقصدِ بعثت کے بیان کے ضمن میں قرآن حکیم کی اہم ترین آیت ہے۔ (واضح رہے کہ یہ آیت اس سے قبل سورۃ الصّف کے درس کے ضمن میں ہمارے مطالعے سے گزر چکی ہے) اس آیت کو اگر پورے قرآن مجید کا عمود قرار دیا جائے تو غلط

نہ ہوگا۔ فرمایا: ﴿هُوَ الَّذِیْۤ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّیْنِ كُلِّهٖ ؕ﴾: ''وہی ہے (اللہ) جس نے اپنے رسول (محمدﷺ) کو مبعوث فرمایا الہدیٰ (قرآن حکیم) اور دین حق دے کر' تاکہ غالب کر دے اسے پورے کے پورے دین (یعنی نظام زندگی) پر'' ﴿وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِیْدًا ۟﴾ ''اور کافی ہے اللہ گواہی دینے والا۔'' اللہ کا یہ فیصلہ ہے کہ یہ ہو کر رہے گا' اور یہ دعوت درحقیقت اپنی اس منزل سے قریب ہوا چاہتی ہے' کامیابی اس کے قدم چوما چاہتی ہے۔

اگلی آیت میں فرمایا: ﴿مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ؕ﴾ ''محمد (ﷺ) اللہ کے رسول ہیں۔'' ﴿وَالَّذِیْنَ مَعَهٗۤ﴾ ''اور وہ لوگ کہ جو اُن کے ساتھ ہیں۔'' یعنی آپؐ پر ایمان لانے والے آپؐ کے صحابہؓ' آپؐ کے جاں نثار' آپؐ کے دست و بازو' آپؐ کے اعوان و انصار رضی اللہ عنہم اجمعین۔ یہ مقام عظمتِ صحابہ کے بیان کے ضمن میں بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ فرمایا: ﴿وَالَّذِیْنَ مَعَهٗۤ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَیْنَهُمْ﴾ ''اور جو لوگ اُن کے ساتھ ہیں وہ کفار کے مقابلے میں بڑے سخت اور آپس میں انتہائی نرم ہیں۔'' انہیں اس کی پرواہ نہیں ہوتی کہ مقابلے میں ان کا باپ ہے یا بیٹا۔ ان کا رشتہ صرف اللہ اور اس کے رسولؐ سے ہے۔ ان کی تمام محبتیں اس معیار پر اور اسی ایک بنیاد پر ازسرِ نو استوار ہو چکی ہیں۔ جیسا کہ حضورﷺ نے فرمایا: ((مَنْ اَحَبَّ لِلّٰهِ وَاَبْغَضَ لِلّٰهِ وَاَعْطٰى لِلّٰهِ وَمَنَعَ لِلّٰهِ فَقَدِ اسْتَكْمَلَ الْاِیْمَانَ)) ''جس نے کسی سے محبت کی تو اللہ کے لئے کی' کسی سے بغض اور عداوت رکھی تو اللہ کے لئے رکھی' کسی کو کچھ دیا تو اللہ کے لئے دیا اور کسی سے کچھ روکا تو صرف اللہ کے لئے روکا' تو وہ ہے کہ جس نے اپنے ایمان کی تکمیل کر لی۔'' صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اس معیار پر کاملتاً پورے اُترتے ہیں۔ چنانچہ غزوۂ بدر میں چشمِ فلک نے وہ نظارہ دیکھا کہ باپ اِدھر ہے اور بیٹا اُدھر' ماموں اِدھر ہے تو بھانجا اُدھر' بھتیجا اِدھر ہے تو چچا اُدھر۔ اِدھر حضورﷺ ہیں اور اُدھر عباس بن عبدالمطلب ہیں جو اُس وقت تک ایمان نہیں لائے تھے۔ اِدھر حضرت ابوبکر صدیقؓ ہیں اور اُدھر اُن کے بیٹے عبدالرحمٰن۔ اور ایمان لانے کے بعد عبدالرحمٰن بن

ابی بکر (رضی اللہ عنہما) نے جب اپنے والدِ محترم حضرت ابوبکر صدیقؓ سے یہ کہا کہ ابا جان! میدانِ بدر میں آپ میری تلوار کی زد میں آ گئے تھے لیکن میں نے آپ کا لحاظ کیا تو جواب میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: بیٹے' یہ اس لئے تھا کہ تمہاری جنگ حق کے لئے نہیں تھی' خدا کی قسم! اگر کہیں تم میری زد میں آ جاتے تو میں بالکل نہ چھوڑتا۔ اس لئے کہ یہاں معاملہ بالکل بدل چکا ہے۔ تاہم دوسری طرف وہ آپس میں انتہائی نرم اور مہربان ہیں۔ ایک دوسرے کے دکھ درد کو بانٹنے والے' ایک دوسرے کے دکھ اور درد کو اپنے باطن میں محسوس کرنے والے' اس شان کے حامل جس کی تعبیر علامہ اقبال نے ایک شعر میں اس طرح کی ہے کہ ؎

ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم
رزمِ حق و باطل ہو تو فولاد ہے مؤمن!

اور جس کا نقشہ سورۃ المائدۃ میں ان الفاظ میں کھینچا گیا ہے: ﴿یُحِبُّھُمۡ وَیُحِبُّوۡنَہٗۤ اَذِلَّۃٍ عَلَی الۡمُؤۡمِنِیۡنَ اَعِزَّۃٍ عَلَی الۡکٰفِرِیۡنَ﴾ ''ان سے اللہ محبت کرتا ہے اور وہ اللہ سے محبت کرتے ہیں' اہلِ ایمان کے حق میں بہت ہی نرم ہیں لیکن کافروں کے لئے بہت سخت ہیں۔'' کفار کے مقابلے میں ان کے موقف میں کہیں کسی کمزوری کا اظہار نہیں ہوتا۔ ﴿یُجَاھِدُوۡنَ فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ وَلَا یَخَافُوۡنَ لَوۡمَۃَ لَآئِمٍ﴾ ''اللہ کی راہ میں جہاد کرتے ہیں (جان اور مال لگاتے کھپاتے ہیں) اور کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کا کوئی اثر قبول نہیں کرتے۔''

اب ہم سورۃ الفتح کی آخری آیت کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ فرمایا: ﴿تَرٰھُمۡ رُکَّعًا سُجَّدًا یَّبۡتَغُوۡنَ فَضۡلًا مِّنَ اللّٰہِ وَرِضۡوَانًا﴾ ''تم انہیں دیکھتے ہو رکوع کرتے اور سجدہ کرتے ہوئے' وہ اپنے ربّ کے فضل اور اس کی رضا کے متلاشی ہیں''۔ ذہن میں رکھئے کہ بندۂ مؤمن کی شخصیت کے یہ دو رُخ ہیں جن کا ذکر قرآن میں متعدد مقامات پر ملتا ہے۔ ایک رُخ محبتِ خداوندی' جذبۂ عبودیت اور اس کی کیفیات سے متعلق ہے جبکہ دوسرا جہاد و قتال اور ایثار و قربانی سے عبارت ہے۔ یہاں ان الفاظ میں پہلے رُخ کا بیان

ہے کہ: ﴿تَرٰهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا﴾ ان کی زندگی کا یہ نقشہ تمہارے سامنے ہے کہ وہ اللہ کی جناب میں رکوع اور سجود کرنے والے ہیں' وہ اپنے ربّ کے فضل کے طالب اور اس کی رضا کے جویا ہیں۔ ان کا نصب العین بس رضائے الٰہی کا حصول ہے۔ ﴿سِيْمَاهُمْ فِيْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ﴾ ''ان کی نشانی ہے ان کے چہروں میں (ان کی پیشانیوں میں) سجدوں کے اثرات سے''۔ ﴿ذٰلِكَ مَثَلُهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ وَمَثَلُهُمْ فِي الْاِنْجِيْلِ﴾ ''یہ ان کی مثال ہے تورات میں اور ان کی یہ تمثیل ہے انجیل میں بھی''۔ تورات اور انجیل کے بارے میں یہ بات تو سب کو معلوم ہے کہ نبی اکرم ﷺ کے بارے میں پیشین گوئیاں ان کتابوں میں موجود تھیں جن میں سے بہت سی کھرچ دی گئیں' نام ونشان مٹانے کی ہر ممکن سعی کی گئی پھر بھی کہیں کہیں کوئی کوئی پیشین گوئی باقی رہ گئی۔ قرآن مجید کے یہ الفاظ ثابت کرتے ہیں کہ صرف حضور ﷺ کی نہیں بلکہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی علامات کا بیان بھی تورات اور انجیل میں تھا' ان کی شخصیتوں کے نمایاں اوصاف اور خدوخال بھی ان میں درج تھے۔ وہ مشہور واقعہ اس بات کی تائید کرتا ہے جو بیت المقدس کی فتح کے ضمن میں تاریخ کی کتابوں میں محفوظ ہے کہ جب مسلمان افواج یروشلم کا محاصرہ کئے ہوئے تھیں اور محاصرہ بھی بہت طول پکڑ گیا تو وہاں محصور عیسائی رہنماؤں نے کہا کہ ایک درویش بادشاہ کی علامات ہماری کتابوں میں لکھی ہوئی ہیں جس کے ہاتھوں یہ شہر فتح ہو گا۔ بعد میں ثابت ہوا کہ وہ درویش بادشاہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ تھے۔ اس لئے کہ وہ جب بیت المقدس تشریف لائے تو وہاں کے لوگوں نے اپنی کتابوں سے حضرت عمرؓ کا حلیہ ملانے کے بعد شہر کے دروازے مسلمانوں کے لئے یہ کہتے ہوئے کھول دیئے کہ یہی وہ شخص ہے جس کی علامات ہماری کتابوں میں درج ہیں!

آگے فرمایا: ﴿كَزَرْعٍ اَخْرَجَ شَطْـَٔهٗ فَاٰزَرَهٗ فَاسْتَغْلَظَ فَاسْتَوٰى عَلٰى سُوْقِهٖ﴾ ''اس کھیتی کے مانند جو پہلے اپنی سوئی نکالتی ہے' پھر اس کی کمر کو مضبوط کرتی ہے' پھر ذرا موٹی ہوتی ہے' پھر کھڑی ہو جاتی ہے اپنی نال پر''۔ ﴿يُعْجِبُ الزُّرَّاعَ لِيَغِيْظَ بِهِمُ

الْكُفَّارَ﴾ ''کاشت کار کو وہ بڑی بھلی لگتی ہے (اُس کا دل اس کھیتی کو دیکھ کر باغ باغ ہو جاتا ہے) تاکہ دلوں میں جلن پیدا ہو جائے کفار کے''۔ یہاں کھیتی سے مراد صحابہ کرامؓ کی جماعت ہے۔ یہ پودا جو شروع میں بڑا نرم و نازک اور کمزور تھا اب ایک تناور درخت کی صورت اختیار کر چکا ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس کا کاشت کار کون ہے؟ خود اللہ تبارک و تعالیٰ جس کی یہ کھیتی ہے' یا پھر وہ ذاتِ گرامی ﷺ جس نے اپنے خونِ جگر سے اس کھیتی کو سینچا ہے! آپؐ کا دل اس شاندار فصل کو دیکھ کر باغ باغ ہو جاتا ہے۔ اور وہ کفار و منافقین جن کو صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے بغض تھا' ان کی کامیابیوں پر اپنے دل میں جلن اور گھٹن محسوس کرتے ہیں۔ ﴿وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنْهُمْ مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِيْمًا۝﴾ ''ان لوگوں میں سے جو ایمان اور عملِ صالح کے معیار پر پورا اتریں' اللہ نے مغفرت اور اجرِ عظیم کا وعدہ فرمایا ہے''۔ دنیا میں بھی فتح و کامرانی ان کے قدم چوم رہی ہے اور آخرت کے اعتبار سے وہ کامیاب و کامران ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان صاحب ایمان اور نیکوکار لوگوں سے مغفرت اور اجرِ عظیم کا وعدہ کر رکھا ہے۔

صلح کے ٹوٹنے پر قریش کی جانب سے تجدید کی سرتوڑ کوشش

صلح حدیبیہ کے بعد کہ جسے قرآن مجید نے فتح مبین قرار دیا' واقعتاً کامیابیوں نے مسلمانوں کے قدم چومنے شروع کئے اور اس فتح و نصرت کا اظہار دو پہلوؤں سے ہوا۔ ایک یہ کہ جیسا کہ اس سے قبل ایک موقع پر اشارہ کیا جا چکا ہے' اندرونِ عرب دو سال تک یہ صلح قائم رہی اور نبی اکرم ﷺ کو دعوت و تبلیغ کا بھرپور موقع میسر آیا۔ اس دوران بہت سے قبائل نے اسلام قبول کیا اور اسلام کا دائرۂ اثر عرب کے کونے کونے تک پہنچ گیا۔ اور دوسرے یہ کہ اسی عرصے میں آپؐ نے بیرونِ ملک عرب اپنی دعوتی سرگرمیوں کا آغاز فرمایا' آس پاس کے حکمرانوں کی طرف اپنے سفیر بھیجے اور نامہ ہائے مبارک کے ذریعے انہیں اسلام لانے کی دعوت دی۔

قریش کی ایک غلطی سے یہ صلح ختم ہوئی۔ انہوں نے ایک قبیلے کے خلاف کہ جو

مسلمانوں کا حلیف تھا' اپنے ایک حلیف کی مدد کی۔ اس طرح گویا خود انہوں نے معاہدے کی خلاف ورزی کا ارتکاب کیا اور یوں صلح ٹوٹ گئی۔ لیکن اس کے فوراً بعد سردارانِ قریش کو یہ احساس ہوگیا کہ ان سے بہت بڑی حماقت سرزد ہوئی ہے۔ چنانچہ فوراً ہی ان کی جانب سے تجدیدِ مصالحت کی کوششوں کا آغاز ہوگیا کہ کسی طرح صلح دوبارہ ہوجائے۔ ابوسفیان جو اُس وقت تک ایمان نہیں لائے تھے اور قریش کی سرداری کا منصب انہیں حاصل تھا' صلح کی تجدید کے لئے خود چل کر مدینے آئے۔ اس ضمن میں نہایت دلچسپ اور عجیب واقعات سیرت کی کتابوں میں ملتے ہیں۔ ابوسفیان مدینے آتے ہیں اور اپنی صاحبزادی حضرت اُمّ حبیبہ رضی اللہ عنہا جو آنحضور ﷺ کی زوجۂ محترمہ ہیں' کے پاس جاتے ہیں کہ وہ ان کے لئے اپنے شوہر (یعنی نبی اکرم ﷺ) سے سفارش کریں۔ وہاں یہ عجیب معاملہ پیش آتا ہے کہ گھر میں داخل ہوکر جب چارپائی پر بیٹھنے لگتے ہیں تو اُمّ المؤمنین حضرت اُمّ حبیبہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ذرا رکئے! باپ کو روک کر پہلے وہ بستر تہہ کرتی ہیں اور پھر فرماتی ہیں کہ اب بیٹھئے! قریش کا وہ مدبر سردار جس نے ایک دنیا دیکھ رکھی تھی اور جسے بڑے بڑے درباروں میں حاضر ہونے اور وہاں کے رکھ رکھاؤ اور آداب کا مشاہدہ کرنے کا موقع ملا تھا' فوراً پوچھتا ہے: ''بیٹی! یہ بستر میرے لائق نہ تھا یا میں اس بستر کے لائق نہ تھا؟'' اُمّ المؤمنین حضرت اُمّ حبیبہؓ فرماتی ہیں کہ ابّا جان! آپ مشرک ہیں' ناپاک اور نجس ہیں اور یہ بستر محمد رسول اللہ ﷺ کا ہے' لہٰذا آپ اس پر نہیں بیٹھ سکتے......!

نبی اکرم ﷺ کی فراست اور معاملہ فہمی کی ایک نہایت اعلیٰ مثال یہاں بھی سامنے آتی ہے کہ آپؐ نے تجدیدِ صلح کے لئے کی جانے والی ان کوششوں کا کوئی مثبت جواب نہیں دیا اور مشرکین کے ساتھ صلح کی تجدید پر آمادگی ظاہر نہیں کی۔ اس لئے کہ نہ جنگ آپؐ کا اصل مقصود تھی نہ صلح۔ آپؐ کی سعی و جُہد کا اصل ہدف اور مقصود تھا دین کا غلبہ......! جب اس ہدف کے حصول اور دین کی مصلحت کے لئے صلح بہتر تھی تو آنحضور ﷺ نے بظاہرِ احوال دب کر بھی صلح کر لی۔ (صلح حدیبیہ کی شرائط بالکل یک

طرفہ محسوس ہوتی ہیں کہ ان سے بظاہر سارا فائدہ مشرکین کو پہنچ رہا تھا۔) لیکن اب چونکہ صلح کو مزید جاری رکھنے اور صلح کی تجدید کرنے کے معنی یہ ہوتے کہ کفر کو بلا جواز ایک مہلت (Lease of Existence) دے دی جاتی' لہٰذا آنحضورﷺ نے صلح کی تجدید نہیں فرمائی۔ آپؐ صحیح طور پر اندازہ فرما چکے تھے اور جان چکے تھے کہ اب اِن کفارِ قریش اور مشرکین مکّہ میں کوئی قوّتِ مدافعت موجود نہیں ہے۔ غلبہ واقامتِ دین کی منزل اب بہت قریب ہے' آپؐ کی انقلابی جدوجہد اب کامیابی سے ہمکنار ہوا چاہتی ہے' لہٰذا آپؐ نے صلح کی تجدید سے انکار کیا۔

تکمیلِ انقلاب کا عنوان ...... فتح مکّہ

اس کے کچھ ہی عرصے بعد رمضان المبارک ۸ ھ میں آپؐ دس ہزار صحابہؓ کی معیت میں مکّے کی جانب پیش قدمی فرماتے ہیں۔ اب کسی میں دم نہیں تھا کہ مسلمانوں کی قوّت کے سامنے ٹھہر سکتا۔ بعض زیادہ سر پھرے اور جذباتی لوگوں کی طرف سے کچھ تھوڑی سی مزاحمت ہوئی' صرف چند جانیں تلف ہوئیں اور محمد رسول اللہﷺ فاتح کی حیثیت سے مکّے میں داخل ہو جاتے ہیں۔ اس موقع پر انبیاء کرامؑ کی سیرت وکردار کا وہ مشترک پہلو سامنے آتا ہے کہ جس کی اس مقدس جماعت سے باہر کوئی دوسری مثال پیش کرنا ناممکن ہے۔ وہ خون کے پیاسے کہ جن کے ظلم وستم کے باعث آٹھ ہی سال پہلے نبی اکرمﷺ اور ان کے جاں نثار ساتھی اپنی آبائی سرزمین مکّہ چھوڑنے پر مجبور ہوئے تھے اور بمشکل اپنی جان سلامت لے جا سکے تھے' وہی لوگ مغلوبیت کی حالت میں آپؐ کے سامنے تھے اور پورے طور پر آپؐ کے رحم وکرم پر تھے۔ لیکن بجائے اس کے کہ انہیں کوئی لعنت ملامت اور سرزنش کی جاتی' لسانِ نبوت سے یہ الفاظ جاری ہوتے ہیں کہ میں آج تم سے وہی بات کہتا ہوں جو میرے بھائی یوسفؑ نے اپنے ان بھائیوں سے کہی تھی جنھوں نے حضرت یوسفؑ کے ساتھ دشمنی والا معاملہ کیا تھا' یعنی ﴿لَا تَثْرِیْبَ عَلَیْکُمُ الْیَوْمَ﴾ "آج کے دن تم پر کوئی ملامت نہیں"۔ "اِذْھَبُوْا فَاَنْتُمُ الطُّلَقَاءُ" "جاؤ! تم سب کے سب آزاد ہو۔"

اندرونِ ملکِ عرب انقلاب کی تکمیل
اور بیرونِ ملک دعوتی و انقلابی جدوجہد کا آغاز

فتح مکّہ کے بارے میں یہ سمجھ لینا چاہئے کہ اندرونِ ملک عرب یہ گویا کہ نبی اکرم ﷺ کے فیصلہ کن غلبے اور اقتدار کی علامت ہے۔ اس لئے کہ عرب میں خواہ کوئی با قاعدہ مرکزی نظام موجود نہ تھا' کوئی باضابطہ مرکزی حکومت نہ تھی' بہرحال اس خطے میں ''اُمّ القریٰ'' ہونے کا مقام مکّے ہی کو حاصل تھا۔ یہ بات نوٹ کرنے کی ہے کہ مکّہ معظّمہ کو مذہبی اور سماجی اعتبار سے ہی نہیں' معاشی اور سیاسی اعتبار سے بھی ملک عرب کے صدر مقام ہونے کی حیثیت حاصل تھی' جس پر اللہ تعالیٰ نے محمدٌ رسول اللہ ﷺ کو غلبہ اور تمکن عطا فرما دیا اور یوں اندرونِ ملک عرب آپؐ کی انقلابی جدوجہد تکمیل سے ہمکنار ہوئی۔

غزوۂ حنین ...... مشرکین عرب کی جانب سے آخری کوشش

اس کے بعد صرف ایک مزاحمت ہوئی' اور وہ ہوازن اور ثقیف کے لوگوں کی طرف سے تھی۔ یہ قبیلے بڑے زوردار تھے۔ فتح مکّہ کے بعد یہ اہل کفر اور شرک کی طرف سے گویا آخری کوشش تھی۔ جب آنحضور ﷺ کو یہ اطلاع ملی کہ اِدھر جنگ کے لئے تیاریاں ہو رہی ہیں' جمعیت فراہم کی جا رہی ہے' تو آپؐ نے جوابی اقدام کے طور پر اگلے ہی مہینے شوال ۸ ھ میں ان کی سرکوبی کے لئے لشکر کشی کی۔ اس مہم کو غزوۂ حنین کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ بارہ ہزار کا لشکر آپؐ کے ہمراہ تھا۔ ان میں دس ہزار وہ تھے کہ جو مدینہ سے حضور ﷺ کے ساتھ فتح مکّہ کے وقت آئے تھے اور مزید دو ہزار مکّہ سے شریک ہوئے جن میں کچھ وہ بھی تھے جو فتح مکّہ کے بعد ایمان لے آئے تھے اور کچھ وہ بھی تھے جو ایمان تو نہیں لائے تھے لیکن اب ان کی حیثیت حلیفوں کی تھی۔ بارہ ہزار کا لشکر لے کر آنحضور ﷺ مکّہ مکرمہ سے روانہ ہوئے اور وادئ حنین میں وہ واقعہ پیش آیا جس کا ذکر سورۂ توبہ میں سرزنش کے انداز میں آیا ہے:

﴿وَيَوۡمَ حُنَيۡنٍ اِذۡ اَعۡجَبَتۡكُمۡ كَثۡرَتُكُمۡ فَلَمۡ تُغۡنِ عَنۡكُمۡ شَيۡـًٔا وَّضَاقَتۡ عَلَيۡكُمُ الۡاَرۡضُ بِمَا رَحُبَتۡ﴾

''اور یاد کرو حنین کے دن کو جبکہ تمہیں اپنی کثرت پر کچھ ناز ہو گیا تھا تو وہ کثرت تمہارے کسی کام نہ آ سکی اور زمین اپنی تمام تر وسعت کے باوجود تم پر تنگ ہو گئی''۔

اندازہ یہ ہوتا ہے کہ بعض حضرات کے ذہن میں یہ خیال آ گیا ہو گا کہ ایک وقت تھا کہ ہم تین سو تیرہ تھے تب ہم نے مار نہ کھائی' تو آج تو بارہ ہزار ہیں' آج ہمیں کون شکست دے گا......!! اللہ تعالیٰ نے فوراً گرفت فرمائی اور مسلمانوں کو سبق سکھا دیا۔ ہوازن کے لوگ بڑے ماہر تیر انداز تھے۔ وہ گھاٹیوں میں چھپے ہوئے تھے۔ مسلمان جیسے ہی آگے بڑھے اُدھر سے تیروں کی زبردست بوچھاڑ شروع ہو گئی۔ ایسی بھگدڑ مچی کہ تقریباً پورا لشکر تتر بتر ہو گیا۔ بعض روایات کے مطابق گنتی کے چند صحابہ آنحضور ﷺ کے ساتھ رہ گئے تھے۔ لیکن بعض روایات اور غالباً صحیح تر روایات کی رو سے چند سو صحابہ آپؐ کے ساتھ رہے۔ بارہ ہزار میں سے محض چند سو افراد کا باقی رہ جانا بھی بہرحال ایک بہت بڑی بھگدڑ سے کم نہیں! اُس وقت نبی اکرم ﷺ کی ذاتی شجاعت کا ایک عجیب مظاہرہ سامنے آیا۔ آپ سواری سے اترے' علَم اپنے ہاتھ میں لیا اور یہ رجز پڑھتے ہوئے آگے بڑھے: ((اَنَا النَّبِیُّ لَا کَذِبَ اَنَا ابۡنُ عَبۡدِ الۡمُطَّلِبِ)) ''جان لو کہ میں نبی ہوں اور اس میں کوئی جھوٹ نہیں' اور جان لو کہ میں عبدالمطلب کی اولاد میں سے ہوں''۔ یعنی میرے ساتھ بارہ ہزار کا لشکر ہو تب بھی نبی ہوں اور خواہ کوئی میرا ساتھ دینے والا نہ ہو تب بھی نبی ہوں۔ میری نبوت کا دارومدار میرے ماننے والوں کی قلت و کثرت پر نہیں ہے اور یہ کہ میں عبدالمطلب کا بیٹا میدان میں موجود ہوں۔ پھر آپؐ نے صحابہ کو پکارا: ''یَا اَصۡحَابَ الشَّجَرَۃِ'' اے وہ لوگو جنہوں نے میرے ہاتھ پر ایک درخت کے نیچے بیعت کی تھی' آؤ میرے جھنڈے تلے جمع ہو جاؤ! اسی طرح مختلف لوگوں کو نام لے کر پکارا۔ حضور ﷺ کی پکار پر لوگ جمع ہوئے اور آخر کار اللہ تعالیٰ نے فتح عطا فرما دی۔ یہ غزوۂ حنین گویا علامت بن گیا اس بات کی کہ اندرونِ ملک عرب اب کوئی ایسی طاقت موجود

نہیں رہی جو خم ٹھونک کر مسلمانوں کے مقابلے میں آ سکے۔ چنانچہ اس طرح جزیرہ نمائے عرب پر دینِ حق کا غلبہ مکمل ہو گیا۔

آنحضور ﷺ کے حسنِ تدبیر کا ایک اہم واقعہ

غزوۂ حنین کا ذکر نامکمل رہے گا اگر ایک اہم واقعے کا ذکر نہ کیا جائے جس سے یہ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ یہ سارے معاملات کس طرح بالکل انسانی سطح پر ہوئے۔ وہ ساری پیچیدگیاں اور وہ تمام مشکلات جو دنیا کی کسی بھی اجتماعی جدوجہد اور انقلابی عمل میں پیش آ سکتی ہیں، نبی اکرم ﷺ کو بھی ان کا سامنا کرنا پڑا۔ غزوۂ حنین میں جو مالِ غنیمت مسلمانوں کے ہاتھ آیا اس کی تقسیم میں نبی اکرم ﷺ نے تالیف قلب کو مدنظر رکھتے ہوئے مکّہ کے لوگوں کو کہ جو ابھی نئے نئے دائرہ اسلام میں داخل ہوئے تھے، دوسروں کی نسبت زیادہ حصّہ دیا۔ منافقین کو آنحضور ﷺ کے خلاف ہرزہ سرائی کا موقع مل گیا۔ باتیں کہی گئیں اور دھڑلے سے کہی گئیں۔ صورت حال کچھ ایسی تھی کہ فی الواقع جنگل کی آگ کی طرح وہ باتیں پھیل گئیں۔ اعتراض کرنے والوں کی زبانیں بے لگام ہو گئیں اور کھلے عام یہ کہا جانے لگا کہ ''جب جان دینے اور خون نچھاور کرنے کا وقت آتا ہے تو ہم لوگ یاد آتے ہیں اور جب مال کی تقسیم کا معاملہ ہوا تو اب اپنے بھائی بند اور اپنے ہم قبیلہ یاد آ گئے، مال کی تقسیم میں انہیں ترجیح دی گئی ہے''۔ وغیرہ وغیرہ۔ اب یہ بات ایسی تھی کہ بظاہر کچھ ایسی خلافِ واقعہ بھی نہیں تھی۔ اس واقعہ کو صحیح پس منظر میں بھی دیکھا جا سکتا تھا اور غلط رُخ بھی دیا جا سکتا تھا۔ بات پھیلتے پھیلتے حضور ﷺ کے کانوں تک بھی پہنچی۔ نبی اکرم ﷺ کا تدبر دیکھئے۔ آپ ؐ نے صحابہ کرام ؓ کو مجتمع کیا۔ تمام انصار ایک بڑے خیمے میں جمع ہوئے۔ آپ ؐ نے خطبہ ارشاد فرمایا۔ پہلے اپنے احسانات کا، یا یوں کہئے کہ اللہ کے احسانات کا، جو آپ ؐ کے طفیل انصار پر ہوئے، تذکرہ فرمایا۔ اے معشر انصار! کیا یہ صحیح نہیں ہے کہ تم گمراہی پر تھے، اللہ نے میرے ذریعے تمہیں ہدایت دی؟ کیا یہ صحیح نہیں ہے کہ تم ایک دوسرے کے خون کے پیاسے تھے، اللہ نے میرے

ذریعے تمہارے اندر محبت اور اتفاق پیدا کیا؟ انصار جواباً کہتے رہے: بَلٰی یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ! بَلٰی یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ!! حضور ﷺ! بالکل ایسا ہی ہے۔ اے اللہ کے رسول ؐ! آپ بالکل صحیح کہتے ہیں۔ اس کے بعد آپ ؐ نے خطاب کا رُخ بدلا۔ ہاں اے معشرِ انصار! تم یہ کہو کہ اے محمد تمہیں تمہاری قوم نے اپنے گھر سے نکال دیا تھا' ہم نے تمہیں پناہ دی۔ تمہاری قوم تمہارے خون کی پیاسی تھی' ہم نے تمہاری حفاظت کی۔ اور میرا جواب ہوگا کہ ہاں' تم یہ صحیح کہہ رہے ہو' درست کہہ رہے ہو۔ تو اے معشرِ انصار! کیا تمہیں یہ پسند نہیں ہے کہ لوگ بھیڑیں' بکریاں' اونٹ اور دُنیوی مال و اسباب لے کر اپنے گھروں کو جائیں اور تم محمد رسول اللہ (ﷺ) کو لے کر اپنے گھروں کو لوٹو......!!! انصار کی چیخیں نکل گئیں۔ بے اختیار ان کی زبانوں سے نکلا: رَضِیْنَا' رَضِیْنَا!...... ہم راضی ہیں اس پر' ہم راضی ہیں۔ اس طرح آپ ؐ کے حسن تدبیر کی بدولت ایک نہایت تشویش ناک صورتِ حال بالکل تبدیل ہوگئی اور مسلمانوں میں جوش و خروش اور جذباتِ ایمانی کی ایک نئی لہر دوڑ گئی۔ بہرحال غزوۂ حنین کے بعد جیسا کہ عرض کیا گیا' اندرونِ ملک عرب انقلابِ محمدی ؐ کی تکمیل ہوگئی۔

حج کے انتظامات......آنحضور ﷺ کی حکمت عملی

غلبۂ دین حق کی تکمیل کے بعد بھی آپ ؐ نے حج کے معاملے میں خصوصی حکمت عملی اختیار فرمائی۔ ۸ ھ میں جب حج کا موقع آیا تو آپ ؐ نے سابق انتظام کو برقرار رکھا۔ مشرکین کو نہ صرف یہ کہ حج کرنے کا پورا موقع دیا بلکہ حج کا پورا انتظام بھی انہی کے ہاتھوں میں رہنے دیا۔ اگلے سال یعنی ۹ ھ کے حج میں ایک تبدیلی کی گئی۔ مشرکین کو بھی اگرچہ اہل ایمان کے ساتھ حج کرنے کی اجازت برقرار رکھی گئی لیکن حج کے انتظامات کی ذمہ داری اب مسلمانوں کے ہاتھوں میں تھی۔ اس موقع پر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو حضور ﷺ نے امیر الحج مقرر فرمایا تھا۔ چنانچہ آپ ؓ کی زیرِ امارت سن نو ہجری کا حج ادا ہوا۔ اسی موقع پر سورۂ براءۃ (سورۃ التوبۃ) کی ابتدائی آیات نازل ہوئیں جن میں مشرکین مَکّہ کو آخری الٹی میٹم دیا گیا تھا۔ ان آیات کے نزول سے قبل حضرت

ابوبکرؓ قافلۂ حج لے کر روانہ ہو چکے تھے۔ حضورﷺ نے حضرت علیؓ کو بھیجا کہ میرے ذاتی نمائندے کی حیثیت سے اجتماع میں ان آیات کو پڑھ کر سناؤ اور اللہ کی جانب سے مشرکین سے براءت کا اعلان کر دو۔ حضرت علیؓ جب حضورﷺ کے حکم کی تعمیل میں حضرت ابوبکرؓ کے پاس پہنچے تو انہوں نے حضرت علیؓ سے جو پہلا سوال کیا وہ ہمارے لئے بظاہر بڑا عجیب ہے۔ لیکن اس کا ذکر یہاں اسی لئے کیا جا رہا ہے کہ یہ معلوم ہو جائے کہ حضورﷺ نے جو اجتماعی نظام تشکیل دیا تھا اس میں ڈسپلن کی اہمیت کس قدر تھی۔ حضرت علیؓ کو دیکھتے ہی حضرت ابوبکرؓ نے پہلا سوال یہ کیا کہ: ''اَمِیْرٌ اَوْ مَاْمُوْرٌ؟'' (امیر بن کر آئے ہو یا بطورِ مامور آئے ہو؟) یعنی کیا حضورؐ نے آپؓ کو قافلۂ حج کا امیر معین کر کے بھیجا ہے یا امارت کی ذمہ داری بدستور مجھ پر ہے؟ حضرت علیؓ نے جواب دیا کہ امیر آپ ہی ہیں، میں مامور کی حیثیت سے آیا ہوں، تاہم بات صرف اتنی ہے کہ حضورؐ کے ذاتی نمائندے کی حیثیت سے اس اجتماعِ حج میں یہ آیاتِ براءۃ میں پڑھ کر سناؤں گا۔ اس خدمت پر مجھے نبی اکرمﷺ نے مامور فرمایا ہے۔

﴿بَرَآءَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖٓ اِلَى الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝﴾

(التوبۃ: ۱)

مشرکین عرب کے لئے آخری الٹی میٹم

سورۂ براءۃ کی یہ ابتدائی آیات درحقیقت اس بات کا اعلانِ عام ہے کہ اب جزیرہ نمائے عرب میں کفر اور شرک کے لئے کوئی گنجائش نہیں۔ اب تو صورت یہ ہے کہ: ﴿جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ﴾ ''حق آ گیا اور باطل نیست و نابود ہو چکا ہے''۔ چنانچہ اعلان کر دیا گیا کہ اَشہرِ حرم کے ختم ہوتے ہی مشرکین کا قتلِ عام شروع کر دیا جائے: ﴿فَاِذَا انْسَلَخَ الْاَشْهُرُ الْحُرُمُ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ﴾ ''پس جب محترم مہینے ختم ہو جائیں تو قتل کرو مشرکین کو جہاں بھی انہیں پاؤ!'' اب اس جزیرہ نمائے عرب میں کفر اور شرک کے لئے کوئی گنجائش نہیں ہے۔ صرف اہلِ کتاب کو یہ ایک اختیار دیا گیا کہ وہ اگر چاہیں تو چھوٹے ہو کر رہ سکتے ہیں: ﴿يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّهُمْ

صَاغِرُوْنَ﴾ ’’وہ اپنے ہاتھ سے جزیہ ادا کریں اور چھوٹے ہو کر رہیں‘‘۔یعنی وہ اگر چاہیں تو اپنے مذہب پر عمل پیرا رہیں‘ اپنے نجی معاملات میں وہ نصرانیت یا یہودیت پر برقرار رہنا چاہیں تو رہیں‘ لیکن اب یہاں اللہ کا دین غالب ہوگا اور انہیں اس کی بالادستی کو قبول کرنا ہوگا۔مشرکین عرب یعنی بنی اسماعیل کو یہ رعایت نہیں دی گئی‘ اس لئے کہ حضور ﷺ ان ہی میں سے تھے۔آپؐ کی اوّلین بعثت ’’اُمّیین‘‘ ہی میں تھی۔انہی کی زبان بولتے ہوئے آپؐ تشریف لائے‘ آپؐ اسی قوم میں سے تھے۔گویا کہ مشرکین عرب پر اللہ کی طرف سے اتمامِ حجت بدرجۂ آخر اور بتمام وکمال ہو چکا‘ لہٰذا ان کے لئے اب کوئی رعایت اور کوئی گنجائش نہیں!!

ہجرت کے دسویں سال نبی اکرم ﷺ نے بنفسِ نفیس فریضۂ حج ادا فرمایا اور ہجرت کے بعد یہی آپؐ کا پہلا اور آخری حج ہے۔اس میں آپؐ نے وہ خطبہ ارشاد فرمایا جو تاریخ کے اوراق میں نمایاں طور پر ثبت ہے۔عرب کے کونے کونے سے آئے ہوئے سوا لاکھ سے زائد افراد میدانِ عرفات میں جمع تھے۔گویا آپ ﷺ کی ۲۳ سالہ کمر توڑ دینے والی مساعی کا حاصل آپؐ کے سامنے گوش بر آواز تھا۔اس موقع پر آپؐ نے حاضرین سے یہ گواہی بھی لے لی کہ میں نے حقِ تبلیغ ادا کر دیا‘ تبلیغ کا جو بارِ گراں مجھ پر ڈالا گیا تھا میں نے اس کا حق ادا کر دیا۔پھر اللہ تعالیٰ سے بھی یہ عرض کر کے کہ ’’**اَللّٰھُمَّ اشْھَدْ**‘‘ (اے اللہ! تو بھی گواہ رہ کہ میں نے تبلیغ کا حق ادا کر دیا) آپؐ نے اطمینان کا سانس لیا۔گویا اس عظیم ذمہ داری کا بوجھ آپؐ کے کاندھوں سے اتر گیا۔

سورۃ الفتح کی آخری آیات کے درس میں یہ مضمون ہمارے مطالعے سے گزر چکا ہے کہ:

﴿**هُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ كُلِّهٖ ؕ وَكَفٰی بِاللّٰهِ شَهِیْدًا**﴾

آیت کے آخری الفاظ کہ ’’اور کافی ہے اللہ بطورِ گواہ‘‘ کا ربط جڑ جاتا ہے حضور ﷺ کے اس فرمان سے کہ ’’**اَللّٰھُمَّ اشْھَدْ**‘‘ کہ اے اللہ‘ تو گواہ رہ کہ اس جزیرہ نمائے عرب پر

تیرے دین کا غلبہ مکمل ہو گیا۔

بیرونِ عرب دعوتی سرگرمیاں

یہ تو معاملہ تھا اندرونِ ملک عرب کا' اب آیئے اس بات کا جائزہ لیا جائے کہ بیرونِ عرب صورتِ حال کیا تھی۔ جیسا کہ پہلے بھی عرض کیا جا چکا ہے' آنحضور ﷺ دو بعثتوں کے ساتھ مبعوث ہوئے۔ آپؐ کی بعثت خصوصی اہلِ عرب کی طرف تھی اور بعثت عمومی پوری نوعِ انسانی کی طرف۔ ﴿اِلَى كَافَّةِ النَّاسِ﴾ اس بعثت عمومی کے ضمن میں بھی نبی اکرم ﷺ نے اپنے فرائض کی ادائیگی کا آغاز اپنی حیاتِ طیبہ میں فرما دیا تھا اور پھر اُن فرائض کو اُمت کے حوالے کر کے آپؐ اس دنیا سے تشریف لے گئے' جبکہ بعثت خصوصی کی ذمہ داری کُل کی کُل آپؐ نے بنفس نفیس ادا فرمائی۔ چنانچہ حجۃ الوداع کے موقع پر اس کی تکمیل کا اعلان بھی اللہ کی جانب سے ہو گیا۔

﴿اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا ط﴾

بعثت عمومی کے ضمن میں آغازِ کار کے طور پر آنحضور ﷺ نے جو اقدامات کئے ان کا ایک خاکہ ذہن میں جما لیجئے! صلح حدیبیہ ۶ھ میں ہوئی' اور اس کے بعد آپؐ نے آس پاس کے حکمرانوں کی طرف دعوتی خطوط لکھے۔ حضرت عبداللہ بن حذافہ سہمی رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضور ﷺ کا نامہ مبارک لے کر خسرو پرویز کے دربار میں پہنچے۔ اس بدبخت نے آپؐ کے نامۂ مبارک کو چاک کر دیا اور انتہائی گستاخی کی روش اختیار کی۔ وہ تو یہ سمجھتا تھا کہ عرب کا سارا علاقہ اس کی سلطنت میں شامل ہے اور عرب میں رہنے والے سب اس کی رعیت ہیں۔ چنانچہ اس نے یمن کے ایرانی گورنر کو حکم بھیجا کہ (معاذ اللہ' نقل کفر کفر نباشد) یہ کون گستاخ شخص ہے جس نے مجھے خط لکھنے کی جرأت کی ہے' اس کو فوراً گرفتار کر کے میرے دربار میں حاضر کرو!...... وہاں سے دو اشخاص خسرو پرویز کے حکم کی تعمیل میں آپؐ کے پاس مدینہ پہنچے کہ ہمارے بادشاہ نے آپ کو طلب فرمایا ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا میں تمہاری بات کا جواب کل دوں گا۔ اگلی صبح آپؐ نے ان دونوں کو

بلا کر فرمایا کہ جاؤ تمہارا ربّ (بادشاہ) قتل ہو چکا ہے۔ اور فی الواقع اسی رات وہ اپنے بیٹے کے ہاتھوں قتل ہوا تھا۔ آپؐ کے یہ الفاظ بھی تاریخ کی کتابوں میں محفوظ ہیں کہ خسرو پرویز نے میرا خط چاک نہیں کیا' اپنی سلطنت کے ٹکڑے اڑا دیئے ہیں۔ اور وہ سلطنت واقعتاً نسیاً منسیا ہو کر رہی۔

قیصر روم ہرقل کے دربار میں آپؐ کا نامۂ مبارک لے کر حضرت دِحیہ کلبی رضی اللہ تعالیٰ عنہ پہنچے۔ وہ شخص اہلِ کتاب میں سے تھا' نصرانی تھا' صاحبِ علم تھا۔ اس کو یہ پہچاننے میں دیر نہیں لگی کہ یہ وہی رسول ہیں جس کے ہم منتظر تھے۔ لیکن حکومت اور سلطنت کی بیڑیاں اس کے پاؤں میں پڑی ہوئی تھیں لہٰذا وہ ایمان لانے سے محروم رہا۔ تاہم اس نے بھرپور کوشش کی کہ پوری سلطنت اسی طرح اجتماعی طور پر اپنا مذہب تبدیل کر کے اسلام لے آئے جیسے اس سے قبل ایک بار اپنے شہنشاہ کی پیروی میں پوری سلطنت نے عیسائیت کو اختیار کر لیا تھا۔ چنانچہ اس نے دربار لگایا۔ ان دنوں بیت المقدس کے نزدیک غزہ شہر میں حضرت ابوسفیان جو ابھی تک ایمان نہیں لائے تھے' تجارتی قافلہ لے کر پہنچے ہوئے تھے۔ انہیں قیصر روم کے دربار میں طلب کیا گیا۔ بھرے دربار میں جو گفتگو ہوئی اس سے بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ قیصر چاہتا کیا تھا! ہرقل نے اپنے سوالات کے ذریعے یہ کوشش کی کہ ان کے جواب سن کر درباریوں پر یہ بات واضح ہوتی چلی جائے کہ آپؐ نبی برحق ہیں' آپ ہی رسول آخر الزماں ہیں۔ (یہ بات نوٹ کرنے کے قابل ہے کہ حضرت ابوسفیان نے جو اُس وقت مشرکین کے قافلے کے سردار تھے' ہر سوال کے جواب میں صحیح بات بتائی اور غلط بیانی سے گریز کیا) لیکن اس کے درباریوں اور خاص طور پر بطارقہ یعنی عیسائی پادریوں کا ردّعمل نہایت مخالفانہ تھا۔ طیش کے عالم میں ان کے نتھنوں میں سے خرخراہٹیں نکل رہی تھیں۔ ہرقل نے محسوس کیا کہ اس طرح تو اس کا تختِ اقتدار ڈول جائے گا' لہٰذا ایمان سے محروم رہا۔

اسی طرح مصر کا حکمران مقوقس بھی عیسائی تھا۔ اس کے پاس جب آپ ﷺ کا نامۂ مبارک پہنچا تو اسے بھی پہچاننے میں دیر نہیں لگی۔ اس نے جان لیا کہ آپؐ نبی برحق

ہیں۔ اس نے آپؐ کے ایلچی کا احترام کیا' کچھ تحفے تحائف بھی حضورؐ کی خدمت میں بھیجے۔لیکن ایک شخص شرحبیل بن عمرو نے جو رؤساء شام میں سے تھا اور قیصر روم کے زیر اثر سمجھا جاتا تھا' گستاخی کی انتہا کر دی۔ اس کی جانب حضرت حارث بن عمیرؓ حضور ﷺ کے ایلچی کے طور پر آپؐ کا نامۂ مبارک لے کر گئے۔شرحبیل بن عمرو نے انہیں شہید کر دیا۔ یہ واقعہ مملکت روم کے ساتھ اسلامی ریاست کے تصادم کی بنیاد بن گیا۔

سلطنتِ روم کے ساتھ تصادم کا آغاز

سفیر کا قتل بین الاقوامی اخلاقیات میں ایک بہت بڑا جرم تصور کیا جاتا ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے ان کے قصاص کے لئے تین ہزار کا ایک لشکر تیار کیا اور اسے حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زیر کمان شام کی طرف روانہ کیا۔ یہاں سے گویا اب بیرونِ عرب تصادم کا آغاز ہو گیا۔آنحضور ﷺ نے پیشگی طور پر یہ ہدایت دے دی تھی کہ اگر حضرت زیدؓ شہید ہو جائیں تو پھر کمان حضرت جعفر طیارؓ کے ہاتھ میں ہو گی' وہ بھی اگر شہید ہو جائیں تو پھر عبداللہ بن رواحہؓ لشکر کے امیر ہوں گے۔ادھر سے شرحبیل بن عمرو ایک لاکھ کی فوج کے ساتھ مقابلے پر آیا۔ یہاں اب مشورہ ہوا' تین ہزار کا ایک لاکھ کے ساتھ مقابلہ ہے' جنگی نقطہ نگاہ سے کوئی نسبت اور تناسب نہیں بنتا۔آیا لوٹ جائیں یا آگے بڑھیں اور ٹکرا جائیں ....!! مسلمانوں کا ذوقِ شہادت اور جذبۂ جہاد غالب آیا۔ فیصلہ ہوا کہ نہیں' فتح و شکست کے بارے میں سوچنا ہمارا کام نہیں' ہمیں تو اپنا فرض ادا کرنا ہے۔ مقابلہ ہوا۔ یکے بعد دیگرے حضرت زید بن حارثہ' حضرت جعفر طیار اور حضرت عبداللہ بن رواحہ تینوں شہید ہو گئے' رضی اللہ تعالیٰ عنہم وارضاہم اجمعین۔اور پھر کمان ہاتھ میں لی حضرت خالد بن ولید رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اور ایک نہایت خونریز جنگ کے بعد جیسے بھی بن پڑا' بڑی حکمت اور مہارت کے ساتھ اس لشکر کو دشمن کے نرغے سے نکال کر لے آئے۔ جب یہ لشکر مدینے واپس پہنچا تو بعض لوگوں نے اس خیال سے کہ یہ بھگوڑے ہیں اور جان بچا کر میدانِ جنگ سے بھاگ آئے ہیں' لشکر پر باقاعدہ خاک پھینکی۔ نبی اکرم ﷺ نے اس سے منع فرمایا' بلکہ اس لشکر کے دفاع میں سورۃ الانفال ہی

کے الفاظ کا حوالہ دیا کہ یہ بھاگ کر آنے والے نہیں ہیں بلکہ ان کا یہ عمل تو ﴿مُتَحَرِّفًا لِّقِتَالٍ اَوْ مُتَحَيِّزًا اِلٰى فِئَةٍ﴾ (یعنی جنگی حکمتِ عملی کے تحت دوسری فوج سے جا ملنے کے لئے پیچھے ہٹنا) کے زمرے میں آئے گا' اس لئے کہ یہ لوگ اپنی جماعت کی طرف لوٹ کر آئے ہیں تاکہ ایک نئی تیاری کے ساتھ اور پورے اہتمام کے ساتھ از سر نو حملہ کیا جا سکے۔

غزوۂ تبوک۔نہایت کٹھن آزمائش

اس کے بعد نبی اکرم ﷺ نے نفیر عام کا اعلان فرما دیا۔اعلانِ عام کر دیا گیا کہ اب وقت ہے کہ سب لوگ اللہ کے راستے میں نکلیں۔اللہ کے دین پر ایک کٹھن مرحلہ آ گیا ہے' وقت کی عظیم ترین قوّت سلطنتِ روما کے ساتھ تصادم درپیش ہے۔آج کی اصطلاح میں ہم یوں کہیں گے کہ سپر پاورز میں سے ایک کے ساتھ تصادم ہو رہا ہے۔لہٰذا ہر شخص اللہ کی راہ میں نکلے۔سیرت میں یہ پہلا موقع تھا کہ اس طرح نفیر عام کی گئی۔یہ ہجرت کا نواں سال تھا۔سخت گرمی کا موسم تھا۔تبوک کی جانب پیش قدمی کرنی تھی جو مدینہ سے چھ سات سو میل کی مسافت پر تھا۔اس پر مستزاد یہ کہ قحط کا سا عالَم تھا اور اب کھجور کی فصل پک کر تیار تھی۔اندیشہ تھا کہ اگر سب لوگ یہاں سے چلے گئے تو ان فصلوں کو اتارنے والا کوئی نہ ہو گا اور یہ برباد ہو جائیں گی۔پھر یہ کہ ٹکراؤ کس سے ہے؟ سلطنتِ روما سے! اب تک تو مسلمانوں کا مقابلہ اپنے ہم پلہ عربوں کے ساتھ تھا۔مسلمان خود عرب تھے اور ان کے مقابلے میں بھی عرب قوّت تھی۔زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ افواج کی تعداد اور سامان حرب کے لحاظ سے ایک اور دس کی نسبت تھی۔لیکن یہ کہ عرب کا تصادم سلطنتِ روما کے ساتھ ......! کوئی نسبت تناسب بنتا ہی نہیں۔یہ وہ وقت ہے کہ جب نبی اکرم ﷺ کی حیاتِ طیبہ کے دوران اہلِ ایمان کے ایمان کی آخری اور سب سے کڑی آزمائش ہوئی۔یہی وجہ ہے کہ سورۂ توبہ میں تفصیل کے ساتھ اس سفر تبوک میں پیش آنے والے حالات و واقعات کا ذکر بھی ہے اور ان پر ایک مفصل تبصرہ بھی وارد ہوا ہے۔سیرتِ طیبہ میں اس غزوے کو جہاد و قتال فی سبیل اللہ کا نقطہ

عروج قرار دیا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ تیس ہزار کا لشکر لے کر محمد رسول اللہ ﷺ مدینہ سے روانہ ہوئے اور ایک نہایت طویل اور پُر صعوبت سفر طے کر کے تبوک پہنچے۔ (سیرت کی کتابوں میں اس مہم کو ''جیش العُسرۃ'' یعنی ''نہایت سختی اور تنگی کا لشکر'' کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے) تبوک میں آپؐ نے بیس دن قیام فرمایا۔ ہرقل قیصر روم وہاں سے کچھ دور زیادہ فاصلے پر نہیں تھا' قریب ہی موجود تھا۔ لاکھوں کی تربیت یافتہ افواج (standing armies) اس کے ساتھ تھیں۔ لیکن وہ مقابلے کی ہمت نہ کر سکا' بلکہ طرح دے گیا' مقابلے پر آنے سے گریز کیا۔ یہ ایک سوالیہ نشان ہے مؤرخین کے سامنے کہ اس کی وجہ کیا ہوئی؟ نبی اکرم ﷺ بیس دن تک تبوک میں مقیم رہے۔ پورے علاقے پر آپؐ کی دھاک بیٹھ گئی۔ مسلمانوں کا رعب اور دبدبہ قائم ہو گیا۔ آس پاس کے رؤساء نے آ کر اطاعت قبول کی اور اس طرح گویا کہ بیرونِ ملک عرب اسلام کی دعوت اور اس کے پھیلاؤ کا نقطہ آغاز ہو گیا' لیکن ہرقل سامنے نہیں آیا۔ اس کی واحد وجہ یہ سمجھ میں آتی ہے کہ وہ جانتا تھا کہ مقابلے پر اللہ کے رسولؐ ہیں' ان کے ساتھ ٹکرانے کا نتیجہ اس پر خوب عیاں تھا' لہٰذا وہ طرح دے گیا اور مقابلے میں نہ آیا۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین